⊙ ڈاکٹر محمد خاور نوازش

اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اردو، بہاءالدین زکریا یونیورسٹی، ملتان

⊙⊙ عبدالعزیز ملک

لیکچرر، شعبہ اردو، جی سی یونیورسٹی، فیصل آباد

مذہب اور کلچر کا رشتہ اور عصری تناظر
(اقبالؔ اور فیضؔ کے نظریات کی روشنی میں)

Abstract:

Whenever the connection between culture and religion is thrashed out, the most important question arises is that whether religion gives the codes of behavior and designs culture or it is just an element of culture like language, food, sources of production, living style , art and ceremonial traditions. Among so many answers of this query, very argumentative are of Allama Iqbal and Faiz Ahmad Faiz , two legendary Urdu poets of subcontinent. In contemporary condition of our society, the relationship between culture and religion has become more significant. In this article, not only an effort to understand this relationship, according to Iqbal and Faiz, has been made but also the significance and consequences of this relationship in present-day social arrangement been analyzed.

Keywords:

Culture Religion Allama Iqbal Faiz Contemporary Society Religious Geographic Subcontinent Reconstruction Social Conditions

جس سماج میں انتشار کا کُھرا بھوک اور شہوت کے مسائل سے جا ملتا ہو وہاں کعبے کو صنم خانے سے پاسباں ملیں نہ ملیں سہولت کار ضرور مل جاتے ہیں۔ ایسے سہولت کار جو اِن مسائل کے حل کے لیے متعلقہ دَر تک پہنچاتے ہیں اور وہ دَر کسی محفوظ پناہ گاہ میں جا کھلتا ہے۔ اُس جگہ خیال کی شعاع کا داخلہ اگر ممنوع ہو تو باطنی شخصیت کا بَن پیئے بہک جانا بڑی بات نہ ہوگی۔ عصری تناظر میں دیکھا جائے تو ملکی سطح پر جس ہمہ گیر انتشار کی گونج کو اَن سُنا کرنے کے لیے ہم نے اپنے کانوں میں انگلیاں دے رکھی ہیں اُس کا آخری پڑاؤ باطنی شخصیت کی موت ہوگا۔ باطنی شخصیت سے یہاں مراد ضمیر ہے اور اُس کی

آکسیجن خیال ہے۔ خیال جو یہاں آئیڈیا کے معنوں میں لیا جارہا ہے کی نوعیت اور علاقے پر قدغن نہیں بس اِس کے سوتے خشک نہیں ہونے چاہئیں۔ خیال ہے تو ارتقا ہے۔ خیال ہے تو انسان کے پاس طرزِ عمل کا اختیار بھی ہے۔ اور طرزِ عمل پر ہی کسی کلچر کی بنیادیں استوار ہوتی ہیں۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ دراصل خیال ہی کلچر کی اساسی قدر ہے بشرطیکہ وہ جامد نہ ہو۔ انتشار کی حالیہ گونج کا سبب معاشرتی سطح پر دکھائی دینے والی فکری انجماد کی جھلک ہے۔ یہ جھلک اب تک کی ساٹھ ستر ہزار قربانیوں کا نذرانہ قبول کر کے یہیں ختم ہو جائے، اس کے لیے کلچر کی اساسی قدر کی بازیافت ضروری ہے۔ شاید اب حالات بھی سازگار مل جائیں کیونکہ ہماری جغرافیائی صورتحال سے فیض یابی کے لیے پرانے دوستوں اور پرانے دشمنوں کی مشترکہ خواہش ہوگی کہ یہاں اطمینان کی فضا قائم ہو۔

کلچر کی اساسی قدر یعنی خیال کو علامہ نیاز فتح پوری نے مذہب کی اولین صورت قرار دیا ہے(۱)۔ مذہب کی تعریف و توضیح چونکہ اس وقت ہمارے موضوع کا براہِ راست حصہ نہیں اس لیے تفصیل میں جائے بغیر اتنا واضح کر دینا ضروری ہے کہ بات خواہ اتنی سادہ نہ ہو جتنی علامہ نیاز فتح پوری نے کی ہے پھر بھی وہ سماجی حالات جو خیال کا سرچشمہ ہوتے ہیں کسی مذہب کے ظہور میں بھی نظر انداز نہیں کیے جا سکتے۔ بالخصوص عالمگیر مذاہب جیسے کہ مسیحیت اور اسلام۔ ان کا ظہور اپنے وقت کے سماجی حالات کی رُو سے غیر موزوں یا غیر مناسب قرار نہیں دیا جا سکتا۔ ہمارا مذہب اُس وقت کے سماجی حالات کے سیاق میں ایک دینِ مکمل کی حیثیت رکھتا تھا۔ تہذیبی سطح پر دیکھا جائے اس کا ایک پہلو جو ثبات سے متعلق ہے جغرافیائی حدود سے پارہم آہنگی کا ایک بہترین ذریعہ بنا اور دوسرا پہلو تغیر جو باطن کی قوت کو بروئے کار لاتے ہوئے حرکت پر یقین کا دوسرا نام ہے نے زندگی کی ساری ذہنی و مادی سرگرمیوں کو پائیدار تہذیب کے سرمایے کی حیثیت دی۔ ان معنوں میں دینِ اسلام انسان اور معاشرے میں رشتے کو مضبوط کرنے کے لیے آیا۔ اس کا بنیادی مقصد ایسے شعور کو بیدار کرنا تھا جس کے ذریعے کائنات کے وجود کا سنجیدہ مقصد سمجھا جا سکے اور اسے اپنے اندر جذب کیا جا سکے۔ اسلامی ثقافت کی بنیادیں اسی مقصد کو سمجھنے پر استوار ہیں۔ یورپ نے جب شعور کو مذکورہ مقصد سمجھنے کے لیے استعمال کیا اور ارتقا کی طرف بڑھا تو اقبالؔ نے یورپی ثقافت کے عقلی پہلو سے خوفزدہ نہ ہونے کی بات کی اور لکھا:

> ''ایک وقت تھا جب دنیا اسلام سے روشنی حاصل کرتی تھی، جدید تاریخ کا سب سے قابلِ ذکر مظہر یہ ہے کہ دنیائے اسلام تیزی کے ساتھ روحانی طور پر مغرب کی طرف سفر کر رہی ہے۔ اس تحریک میں کوئی خرابی نہیں کیونکہ یورپی ثقافت کا عقلی پہلو، اسلامی ثقافت کی بعض بہت ہی اہم سطحوں کی توسیع ہے۔ ہمیں محض اس بات کا خوف ہے کہ یورپی ثقافت کے خارج کی خیرہ کر دینے والی روشنی ہمارے پاؤں نہ پکڑ لے اور ہم اس ثقافت کے باطن تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب نہ ہو سکیں۔''(۲)

اس ثقافت کے باطن تک رسائی کی خواہش کا منبع بنیادی طور پر باطن کی قوت کو بروئے کار لانے سے حاصل ہونے والے نتائج ہیں۔ اس سے مراد یورپ کی وہ مادی ترقی نہیں جسے اقبال خارج کی خیرہ کر دینے والی روشنی قرار دیتے ہیں بلکہ ارتقائے انسانی ہے۔ اقبالؔ کے خیال میں یورپی ثقافت کا عقلی پہلو اس اشارے پر اساس ہے جو قرآن نے حواس کے

ذریعے حصولِ علم کی طرف کیا تھا۔ اس میں پہل یقیناً انسان کی طرف سے ہی ہوگی۔ لکھتے ہیں:

''یہ انسان ہی ہے جو اپنے گرد پھیلی ہوئی کائنات کی گہری امنگوں میں شریک ہوتا ہے اور اپنی اور اپنے ساتھ ساتھ کائنات کی تقدیر کی صورت گری کرتا ہے' کبھی قوتوں کے ساتھ خود مطابقت پیدا کرتا ہے اور کبھی اپنی تمام طاقت اپنے اغراض و مقاصد کے پیشِ نظر قوتوں کی تربیت پر صرف کرتا ہے اور اس ترقی پذیر تغیر کے عمل میں خدا کا رفیقِ کار بن جاتا ہے مگر شرط یہ ہے کہ پہل انسان کی طرف سے ہو۔ اگر وہ پہل نہیں کرتا، اگر وہ ہستی کے باطن کی قوت کو بروئے کار نہیں لاتا' اگر وہ آگے بڑھتی ہوئی زندگی کے ریلے کو محسوس کرنا چھوڑ دیتا ہے تو اس کے اندر کا جوہر پتھر کی طرح سخت ہو جاتا ہے اور وہ مردہ مادے کی طرح پست سطح تک گر جاتا ہے۔''(۳)

ہم بحیثیت قوم اسی عمل سے گزر رہے ہیں۔ زندگی کے آگے بڑھتے ہوئے ریلے کو محسوس کرنے سے عاری ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ مذہب کی موجودہ شکل جس میں روحانیت ہی روحانیت ہے اٹل ہے۔ مذہب میں تفکر کی اہمیت سے انکار بہت سے مسائل کی جڑ بنا ہوا ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی کے بقول:

''اجتہاد کا دروازہ بند ہے۔ نئی فکر سے ہم خوفزدہ ہیں۔ مذہب کی موجودہ شکل کو ہم نے اٹل سمجھ کر تاریخی بہاؤ سے دُور کر دیا ہے۔ ہمارے ذہن ہر سطح اور ہر مسئلے پر اُلجھے ہوئے ہیں اور ہم زندگی کے چوراہے پر کھڑے تیزی سے آنے جانے والوں کو حیرتی بن کر تک رہے ہیں۔ مذہب کو زندگی کی نفی میں لگا کر ایک طرف ہم نے اس کی روح کو مردہ کر دیا ہے اور دوسری طرف زندگی کا دریا مسلسل بہہ رہا ہے اور ہم رفتہ رفتہ بدل رہے ہیں۔''(۴)

مذہب زندگی کی نفی نہیں بلکہ ارتقا پر یقین کے دَروا کرتا ہے۔ اس میں سماجی حالات کے پیشِ نظر اجتہاد کی گنجائش موجود رہتی ہے اس لیے کسی سماج کے کلچر کی تحدید یا تعین میں اساسی حیثیت تو اِسے حاصل ہو سکتی ہے لیکن کل کا درجہ نہیں مل سکتا۔ اس نکتے پر علامہ اقبالؔ اور فیض احمد فیضؔ ایک ہی نظریے کے حامل ہیں۔ اقبالؔ جب کہتے ہیں کہ انسان کی باطنی دنیا میں ایسی روشنی موجود ہے جو خارجی قوتوں کے ساتھ مطابقت کی راہ نکالتی ہے اور اسلام میں مثالی اور حقیقی دو متحارب قوتیں نہیں بلکہ ان میں مصالحت ممکن ہے(۵) تو ایک ایسا راستہ دکھاتے ہیں جس پر چلتے ہوئے کلچر کے اُن زندہ اجزاء کے انضباط پر غور ہو سکے جو اسلام میں خیر کے تصور سے متصادم نہ ہوں۔ اقبالؔ لکھتے ہیں:

''مثالی کی زندگی اس پر مبنی نہیں ہے کہ وہ حقیقی سے اپنا رشتہ مکمل طور پر منقطع کر لے۔ اس سے تو زندگی کی نامیاتی کلیت تکلیف دِہ تضادات کی صورت میں بکھر جائے گی۔ مثالی اپنی مستقل جدو جہد میں اس مقصد کے ساتھ حقیقی کو بہتر بناتا ہے کہ بالآخر وہ اسے اپنے اندر جذب کر سکے۔ اسے اپنے جیسا بنا لے اور اس کی پوری ہستی کو روشن کر دے..... اسلام مثالی کا حقیقی کے ساتھ تعلق پیشِ نظر رکھتے ہوئے مادی دنیا کو 'ہاں' کہتا ہے اور تسخیر کرنے کی راہ بجھاتا ہے تاکہ زندگی میں حقیقت پسندانہ باقاعدگی کی بنیاد تلاش کی جا سکے۔''(۶)

مذہب کا اس صورت میں مادی دنیا کو 'ہاں' کہنا ایسے کلچر کو جنم دیتا ہے جس میں مذہبی عقائد اور اصولوں کی خالص شکلوں کے ساتھ ساتھ اُن غیر خالص شکلوں کے لیے بھی جگہ بن جاتی ہے جو کسی قوم کی روایات، تاریخ اور جغرافیے پر اساس ہوتی ہیں۔ فیضؔ صاحب ان تمام شکلوں کو دین سے متصادم نہ ہونے کی صورت اپنے کلچر کے لیے قابلِ قبول سمجھتے ہوئے کہتے ہیں:

''جو عناصر زندہ اور ہماری روایات کا حصہ ہیں' اُن کے بارے میں یہ سوچنا چھوڑ دیجیے..... کہ اگر وہ آپ کے دین سے متصادم نہیں ہے تو یہ اسلامی نہیں ہے اس لیے ہمارا نہیں ہے۔ پنجابی زبان اسلامی نہیں ہے۔ لسّی پینے کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں۔ میں نے ایک طرح کے کپڑے پہنے ہیں اور آپ نے دوسری طرح کے اس کا بھی اسلام سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ سب دنیوی چیزیں ہیں ان کو دنیوی سمجھ کر قبول کر لیجیے۔''(۷)

مذہب اور کلچر کے باہمی رشتے کے حوالے سے فیضؔ صاحب ایک اور موقعے پر کہتے ہیں:

''..... کلچر اور دین کا باہم رشتہ کیا ہے؟ ہمارے ہاں یہ بہت بنیادی مسئلہ ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ ہمارے کلچر کی بنیاد ہمارا دین ہے۔ دین باطنی چیز ہے۔ دین کی وجہ سے زندگی کی بہت قدریں متعین ہوتی ہیں لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ کلچر کے بہت سے اجزا ایسے ہیں جن کو مذہب یا دین متعین نہیں کرتا۔ خاص طور پر مذہب اسلام متعین نہیں کرتا۔ بعض مذاہب ایسے ضرور ہیں جن کا تعلق کسی نسل سے ہے یا کسی جغرافیہ سے ہے جیسا کہ ہندو مذہب یا صہیونی مذہب ہے اور اس کا تمدن ہے جس میں کہ نسل کو براہِ راست دخل ہے۔ لیکن ہمارا مذہب اور اسی طریقے سے مسیحیت، عالمگیر مذاہب ہیں۔ ظاہر ہے کہ آپ اسلام یا مسیحیت کو کسی قوم کے ساتھ مخصوص نہیں کر سکتے۔ چونکہ آپ ان کو کسی قوم کے ساتھ مخصوص نہیں کر سکتے اس لیے مختلف اسلامی ممالک کی تہذیبیں یا کلچر ایک دوسرے سے الگ الگ ہیں۔''(۸)

ہماری ہیتِ مقتدرہ میں کلچر کی حدود عقائد پر اساس خالص شکلوں کے ساتھ ہی ختم ہو جاتی ہیں۔ قومی ٹریڈ مارک کی تشکیل سازی کے لیے جب تک غیر ملکی تیل کے کنوؤں سے توانائی حاصل کی جاتی رہے گی اُس وقت تک یہ حالت تبدیل ہونا اتنا آسان نہیں۔ فیضؔ کے مندرجہ بالا بیان سے کچھ لوگوں نے یہ نتیجہ بھی اخذ کرنے کی کوشش کی کہ کلچر کے ضمن میں فیضؔ کے افکار اقبالؔ سے متصادم ہیں۔ اقبالؔ مسلم قومیت کی بات کرتے ہوئے چونکہ جغرافیائی حدود کے قائل نہیں تھے سو مسلم کلچر کے ضمن میں فکرِ اقبالؔ کے اس نکتے کو بار بار دہرایا گیا کہ اُن کے بقول ہم ایک چمن اور ایک شاخسار سے ہیں سو ہم پر رنگ و بُو کی تمیز حرام ہے جبکہ فیضؔ اس تمیز کو بھی اہم جانتے ہیں اور کلچر کے تعین کاروں میں مذہب کی طرح جغرافیے کی کلیدی حیثیت بھی تسلیم کرتے ہیں۔ اس نکتے کی وضاحت کے لیے ہم فیضؔ صاحب کے ہی درج ذیل بیان سے رُجوع کرتے ہیں:

''اسلام، اسلامی تہذیب یا قومی تہذیب میں کوئی فرق یا تضاد نہیں ہے۔ ہر قومی تہذیب اسلامی تہذیب ہے بشرطیکہ اس کے اخلاق و عقائد وہی ہوں جن کی کہ مذہب اسلام تلقین کرتا

ہے..... جب علامہ اقبال نے یہ کہا تھا کہ

ما پروردۂ یک شاخساریم

اور اس لیے رنگ و بُو کی ہمیں تمیز نہیں کرنی چاہیے اُن کہ مراد یہ نہیں تھی کہ دنیا کے اسلامی ممالک اپنی تہذیب سے روگش ہو جائیں یا اپنی تہذیب کو بھول جائیں یا سب کے سب ایک دوسرے میں مدغم ہو جائیں۔ ان کی مراد بھی یہی تھی کہ جو ہمارے عقائد، اخلاق اور روایتیں یکساں ہیں، ان میں ایک دوسرے میں تمیز نہ کریں اور ان کی بنیاد پر عالمِ اسلام میں اتحاد پیدا کرنے کی کوشش کریں لیکن اقبال کی مراد یہ نہیں تھی کہ ایرانی عرب ہو جائیں یا تُرک ہو جائیں۔ یہ اتحاد تو دینی و ملی اتحاد تھا۔ یہ میرے نزدیک قومی تہذیبوں کی نفی نہیں کرتا......اگر آپ کسی قوم کو دوسری قوم پر غالب کریں گے یا مسلط کریں گے تو بجائے اس کے کہ اس سے اتحاد پیدا ہو، اس سے لازماً افتراق پیدا ہوگا۔،،(۹)

کلچر کے ایسے اجزا جن کا براہِ راست مذہب سے کوئی تعلق نہیں ہوتا دینی اتحاد و یگانگت سے انکار نہیں کرتے۔ وہ تو ایک مخصوص جغرافیائی یا قومی شناخت کو ابھارتے ہیں۔ جغرافیائی شناخت کی اصطلاح کچھ لوگوں کو غیر مناسب محسوس ہو سکتی ہے لیکن میرے خیال کی نمائندگی اسی کے استعمال میں بہتر ہو سکتی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ہر کلچر کا ایک مخصوص جغرافیہ ہوتا ہے۔ اُس جغرافیے کے طبعی حالات وہاں کی سماجی صورتحال کی تشکیل میں اساسی درجہ رکھتے ہیں۔ اُس جغرافیے کا رہن سہن، معاش، خوراک، زبان، مزاج، اخلاق و عادات بھی اتنے ہی اہم ہوتے ہیں جتنا کہ وہاں کے لوگوں کا مذہب۔ اُس جغرافیے کا پیداواری عمل، تجربے، مشاہدات، تحقیقات، جستجوئیں اور اُمنگیں جس شعور سے جڑی ہوتی ہیں وہ نسلی نہیں بلکہ کسبی ہوتا ہے اور یقیناً ارتقا پذیر ہوتا ہے۔ پھر اُس جغرافیے میں آباد لوگوں کے فنون جن سے جذبات و احساسات اور جبلتوں کا اظہار ہوتا ہے۔ یہ سب کلچر کا مجموعہ ہیں اور اس مجموعے میں شامل کوئی بھی شے جو مذہب سے متصادم نہیں کلچر قرار دی جا سکتی ہے بشرطیکہ مذہب میں بقول اقبال مادی دنیا کو 'ہاں' کہتے ہوئے تسخیر کرنے کا پہلو مدِنظر رکھا جائے اور اس کے ظہور کو استقرائی عقل کا ظہور سمجھا جائے۔

عصری تناظر میں دیکھا جائے تو ثقافتی شناخت میں مذہب کے علاوہ دیگر زندہ عناصر سے یکسر انکار کا رویہ نظر آتا ہے۔ خیال پر پہرے ہیں۔ برداشت کا عنصر ختم ہو رہا ہے۔ حقیقی تاریخ کے بجائے ایسی تاریخ پڑھائی جا رہی ہے جس میں ماضی کی مخصوص تشکیل کی گئی ہو۔ زندگی کا مخصوص روزمرہ اُس تصورِ حقیقت پر اساس ہے جس سے تغیر یا حرکت کا اُصول منہا کر دیا گیا ہے۔ ایسے میں مذہب اور کلچر کے رشتے کی تزئین جب تک قریب اور دُور کی نظر کا عدسہ ایک ہی عینک میں لگا کر ازسرِنو نہیں کی جائے گی' نوعِ انسانی کو جہنم کا ایندھن قرار دینے والے طبقے سے فکری جنگ لڑنا آسان نہیں۔ مذہب اور کلچر کے مضبوط رشتے کی بنیاد میں کارفرما بصیرت افروز جذبہ جسے آغاز میں ہماری باطنی شخصیت کے لیے آکسیجن بتایا گیا تھا، زندہ اور متحرک رہنا چاہیے۔ یہ جذبہ مر جائے یا جامد ہو جائے ہر دو صورتوں میں بھوکوں اور شہوت زدوں کو سہولت کار بآسانی ملتے رہیں گے۔

حوالہ جات

۱۔ نیاز فتح پوری، مذہب، (لاہور: فکشن ہاؤس، ۲۰۱۴ء)، ص ۱۶

۲۔ علامہ اقبال، اسلامی فکر کی نئی تشکیل، (لاہور: مکتبہ خلیل، ۲۰۰۵ء)، مترجم: شہزاد احمد، ص ۲۳

۳۔ اسلامی فکر کی نئی تشکیل، ص ۳۰

۴۔ جمیل جالبی، پاکستانی کلچر، (اسلام آباد: نیشنل بک فاؤنڈیشن، ۱۹۸۷ء)، ص ۱۳۱

۵،۶۔ اسلامی فکر کی نئی تشکیل، ص ۲۵

۷۔ شیما مجید، فیض احمد فیض اور پاکستانی ثقافت: تحریریں اور تقریریں، (کراچی: پاکستان اسٹڈی سنٹر، ۲۰۰۶ء)، (مرتبہ)، ص ۸۰

۸۔ ایضاً، ص ۲۱۔۲۲

۹۔ احمد سلیم، فیض: لوک ورثہ اور تہذیب و ثقافت کے مسائل، (لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۶ء)، (مرتبہ)، ص ۱۰۵۔۱۰۶